فلپائن، بنکاک اور بنگلہ دیش کا سفر نامہ

جناب خلیل حامدی صاحب

(۲)

موجودہ صدر اور ان کی قومی حیثیت احمد اسماعیل نے بتایا کہ سلامت ہاشم ازہر یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہے۔ جدید مطالعہ کے ساتھ ساتھ اُسے دینی علم پر گہری نظر حاصل ہے۔ اخلاق و کردار کا بھی اُونچا انسان ہے۔ ان تمام پہلوؤں کے علاوہ احمد اسماعیل کے جانے کے بعد علی خنانی نے ایک اور اہم نکتہ بھی سلامت ہاشم کی مقبولیت کا بتایا۔ وہ نکتہ واقعی دلچسپ ہے۔

مورو قوم کے تین طبقات علی خنانی نے مورو قوم کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ قوم تین طبقوں پر مشتمل ہے۔ ایک طبقہ وہ ہے جو سمندروں میں رہتا ہے اور ماہی گیری وغیرہ ان کا بالعموم پیشہ ہے۔ نسلی لحاظ سے یہ لوگ "سمر" (گندمی رنگ والے) کہلاتے ہیں۔ یہ خود بھی تسلیم کرتے ہیں اور دوسرے بھی ان کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ ساداتِ مکّہ کے غلاموں کی نسل میں سے ہیں۔ اس طبقے کو تیسرا درجہ حاصل ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو ہے تو کسی حد تک تعلیم یافتہ لیکن اُس کا نسلی تعلق مورو سلاطین میں سے کسی سلطان کے ساتھ نہیں ہے۔ یہ دوسرے درجے کے لوگ ہیں۔ مثلاً جزیرہ تاوی تاوی کے باشندے اکثر و بیشتر اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور تیسرا طبقہ ان تعلیم یافتہ لوگوں پر مشتمل ہے جو آلِ سلاطین کہلاتے ہیں۔ سلامت ہاشم ایک سلطان جو سلطان آف فدرت کہلاتا تھا، کی اولاد میں سے ہیں۔ اِس لیے ذاتی صلاحیت اور اخلاقی پاکیزگی کے ساتھ ان کو نسبی عظمت بھی حاصل ہے۔ ان کے مقابلے میں نُور مسواری سولو (Sulu) جزیرے کی تیسری کلاس سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ سلامت ہاشم مورو عوام کی نظر میں جو درجہ اور مقبولیت حاصل کر سکتا ہے نُور مسواری وہ درجہ

اور مقبولیت حاصل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ علی حنافی کا یہ تجزیہ میں نے کچھ اور لوگوں سے بھی بیان کیا انہوں نے بھی اس کی تائید کی۔ قبائلی معاشرے میں اس طرح کے تصورات کا پایا جانا بعید نہیں ہے۔

امام مسجد کا کردار ظہر کی نماز اور کھانے کے لیے میں اور علی حنافی شہر نکل گئے۔ شہر بڑا تو نہیں ہے، لیکن ہے پُر رونق اور منظر آفرین۔ مچھلی مارکیٹ کے سامنے ایک مسجد ہے۔ ظہر کی نماز کے لیے اُس میں داخل ہوئے۔ جماعت ختم ہو رہی تھی، ہم نے اپنی الگ نماز پڑھ لی۔ جماعت میں شامل لوگوں کی تعداد ۸—۱۰ تھی۔ کچھ حضرات مسجد کے اندر ادھر اُدھر سو رہے تھے۔ نماز کے بعد چند نوجوان اور مسجد میں آگئے۔ امام صاحب سے تعارف ہوا۔ ان کا نام حاجی زین العابدین ابن سلطان توکل زید ہے۔ انہوں نے مکہ معظمہ میں قرآن حفظ کیا ہے۔ عربی اچھی بول لیتے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۵۰ برس کے قریب ہوگی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اس مسجد میں امامت اور خطابت کے فرائض انجام دیتے ہیں، لیکن اس خدمت کا وہ کوئی معاوضہ نہیں لیتے، بلکہ بعد میں اور دوستوں نے بھی بتایا کہ یہاں کے علما جو مساجد میں خدمت انجام دیتے ہیں کوئی تنخواہ نہیں لیتے اور نہ تنخواہ لینا پسند کرتے ہیں۔ اپنا الگ کاروبار کر کے معاش حاصل کرتے ہیں۔ جب ہم امام صاحب سے گفتگو کر رہے تھے تو وہ تمام لوگ جو نماز کے لیے یہاں آئے تھے اس میں شریک ہو گئے۔ بعد میں آنے والے اور نمازی بھی اس محفل میں شامل ہو گئے۔

مسجدوں کا طرزِ تعمیر پوری مسجد لکڑی کی بنی ہوئی ہے۔ ۳۰ سال پرانی ہے۔ لکڑی پر پھول بوٹے تراشے ہوئے ہیں۔ یہاں مسجدیں چوکور بنائی جاتی ہیں۔ محراب، منبر، گنبد اور چھوٹے چھوٹے منارے مساجد کا عالمی نشان ہیں۔ پوری مسجد فرش سے چھت تک دیواروں سمیت لکڑی کی ہے۔ اس کا صحن نہیں ہے، بلکہ کسی مسجد میں صحن نہیں ہے۔ شمال اور جنوب میں مسجد کے طول کے مطابق ہی کمرے بنے ہوئے ہیں۔ ایک کمرہ بچوں کو قرآن کریم اور عربی زبان کی تعلیم دینے کے لیے ہے۔ اور دوسرا کمرہ عورتوں کی نماز کے لیے۔ یہاں عورتیں بھی مسجد میں آتی ہیں۔ جمعہ کے روز پابندی کے ساتھ اور عام نمازوں میں فرصت کے مطابق۔ ہم جس مسجد میں ہیں، پرانی ہونے کے باوجود خوبصورت لگتی ہے۔ لیکن صفائی کا انتظام خاطر خواہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ مسلمانوں کی غربت ہے۔ یہاں کا مسلمان

غریب بھی ہے اور کشتۂ تیغِ ستم بھی۔

ایک امام مسجد سے تعارف امام صاحب حاجی زین العابدین بن سلطان توکل زید نے مجھے رابطہ عالم اسلامی، مکہ معظمہ کا ایک خط دکھایا۔ یہ خط شیخ محمد علی الحرکان مرحوم کے دستخطوں سے ۱۹۸۲ء میں جاری ہوا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ رابطہ کی طرف سے حاجی زین العابدین کو ۱۵ سو ریال ماہوار تنخواہ پر کینیا (مشرقی افریقہ) میں قرآن کریم کی تعلیم کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ خاکسار نے حاجی زین العابدین سے دریافت کیا کہ آپ ابھی تک کینیا کیوں نہیں گئے؟ اس نے جواب دیا کہ میری بیوی بلڈ پریشر کی مریضہ ہے۔ نہ اسے یہاں چھوڑ سکتا ہوں نہ ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ یہ تو حاجی صاحب کا جواب ہے لیکن مجھے رابطہ عالم اسلامی کے اس فیصلے پر سخت افسوس ہوا۔ یہ ملک جس میں مورو مسلمان آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اور تعلیمی لحاظ سے انتہائی پسماندہ ہیں یہ ملک خود اصحاب علم و دعوت کا محتاج ہے۔ یہاں سے کسی عالم کو اٹھا کر دوسرے دور دراز ملک میں بھیج دینا دانش مندانہ فیصلہ نہیں ہے۔ اس ملک کے ساتھ سچی خیر خواہی یہی ہے کہ یہاں کے اہل علم و دعوت کو اسی قوم کے اندر کام پر لگایا جائے۔ امام زین العابدین اچھا سمجھ دار، با اثر اور صاحب کردار مبلغ معلوم ہوتا ہے۔ ماہی گیروں کے اندر رہنا ہی اس کے لیے مفید ہے۔

فاطمہ ریسٹوران میں مسجد کے اندر چند اور مسلمانوں سے تعارف ہوا۔ ان میں سے ایک صاحب عبدالبیان تو بہت ہی کھل گئے۔ یہ محاذ آزادی کے خدمت گاروں میں سے ہیں۔ مسجد سے نکل کر ہم کسی ریستوران کی تلاش میں نکل گئے تاکہ دوپہر کا کھانا کھا لیا جائے۔ عبدالبیان صاحب نے اس بارے میں ہماری خوب رہنمائی کی۔ وہ ہمیں ایک مسلمان خاتون کے ریستوران میں لے گئے جو تیسرے درجے کا ریستوران تھا۔ خاکسار نے عرض کیا کہ کسی اور ذرا بہتر ریستوران میں چلتے ہیں، عبدالبیان صاحب نے جواب دیا کہ ہر جگہ آپ کو چاول اور مچھلی کے بنے ہوئے کھانے ملیں گے۔ اس ریستوران اور اعلیٰ درجے کے ریستوران میں اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہوگا، البتہ جو کھانا ہم یہاں ۲۰ پیسو میں کھائیں گے وہی کھانا اعلیٰ ریستوران میں ایک سو پیسو میں کھائیں گے۔ خاکسار اس کا جواب سن کر سراسیمہ ہو گیا اور

آخر اسی ریستوران میں فاطمہ نامی معمر مسلمان خاتون کا پکا ہوا کھانا کھایا۔ فاطمہ نے جب ٹیبل پر کھانا سجایا تو مچھلی کی اتنی اقسام سامنے آگئیں کہ اس سے پہلے مچھلی کے ان کرشموں کا مجھے تجربہ نہیں ہوا۔ سائز کے لحاظ سے متعدد قسمیں اور پکانے کے لحاظ سے گوناگوں رنگ روپ۔ یہ لوگ ماہی گیر ہیں اور اسی ایک جانور کو غذا بنا کر اس میں تنوع پیدا کر لیتے ہیں۔ کھاتے پر ہم تین تھے: خاکسار، علی غنافی اور عبدالبیان۔ خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ اور کل بل ۴۰ پیسو بنا۔

کاروباری زندگی میں عورتوں کا حصہ

فاطمہ ریستوران کا یہ پہلو تو اچھا نکلا۔ ریستوران تھا بھی صاف، مگر مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ ایک خاتون نے ریستوران کھول رکھا ہے اور اپنی نوجوان لڑکیوں کو بیرے اور خانسامے بنا رکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ریستوران کو رونق بخشنے کے لیے ڈسکو گانوں کے ریکارڈ بھی آوازِ بلند سے چل رہے ہیں اور ایک لڑکی کاؤنٹر پر بیٹھی اس شغل کو اپریٹ کر رہی ہے۔ میں نے تو دونوں دوستوں کے سامنے اس پہلو پر سخت تنقید کی اور صاف عرض کیا کہ مجھے معاف فرمایئے: یہ بات اسلام کے قطعاً منافی ہے۔ عبدالبیان بڑا کھسیانا ہوا۔ پہلے تو خاموش رہا۔ پھر جرأت کر کے کہنے لگا: "یہاں مسلمانوں کے لیے یہی کام رہ گئے ہیں، وہ اور کیا کام کریں"۔ میں نے عرض کیا: "مرد یہ کام کریں" کہنے لگا: "مرد بھی کرتے ہیں اور عورتیں بھی۔ ہمارا معاشرہ مخلوط ہے"۔ بہرحال یہ ایک ایسی عام وبا ہے کہ اس میں کسی شخص کو ہدفِ تنقید بنانا لاحاصل ہے، مگر میں نے دل میں یہ طے کیا کہ مورو محاذ کے ذمہ دار لوگوں سے اس موضوع پر بحث کروں گا۔

کھانا کھا کر باہر نکلے اور ٹہلتے ٹہلتے اپنے ہوٹل کا رُخ کیا۔ بازار میں گزرتے وقت مزید دل خراش مناظر ملے۔ پورے بازار میں فٹ پاتھوں پر بھی اور کھوکھوں میں عورتیں، بوڑھی اور جوان بھی بیٹھی ہوئی ہیں۔ ہر ایک نے تھوڑا تھوڑا سودا لگا رکھا ہے۔ کسی کے پاس دو چار مرغیاں ہیں (مرغی کی قیمت ۳۰ پیسو)، کسی کے پاس انڈے (دو پیسو فی انڈہ)، کوئی لکڑی کے گٹھے لے کر بیٹھی ہوئی ہے، کوئی ماچس اور موم بتی۔ کسی کی چھابڑی میں امرود اور سگریٹ ان کے لباس بھی کوئی ڈھنگ کے نہیں ہیں۔ دکانداروں اور خریداروں میں بے تکلفی کی بھرپور فضا پائی جاتی ہے۔

دریائے کوتاباتو چند قدم آگے نکلے تو ان کھوکھوں کی پشت پر دریا نظر آیا۔ اسے دریائے کوتاباتو کہتے ہیں۔ شمال میں پارانگ (PARANG) سے نکلتا ہے اور جنوب میں دباؤ (DAVAO) میں جا گرتا ہے۔ یہ میں نے اس لیے بیان کر دیا کہ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ مجاہدین مورو کا دریا ہے۔ مینڈاناؤ میں ان کی ساری کارگر میاں اس دریا کے اندر اور اس کے آر پار جاری رہتی ہیں۔ اس کا پاٹ بہت بڑا ہے۔ چپو سے چلنے والی کشتیوں سے لے کر سٹیمر تک اس میں چلتے ہیں۔ مزید تفصیل آگے کہیں آئے گی۔

کوتاباتو شہر کے وسط میں سے یہ دریا گزرتا ہے۔ دریا کا شمالی علاقہ خوشحال ہے اور جنوبی علاقہ غریبوں کا مسکن ہے۔ دریا کے دونوں کناروں پر اور ہر کنارے کے اندر بھی کسی حد تک لوگوں نے اپنے جھونپڑے بنا رکھے ہیں۔ عبدالبیان نے جھونپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ فقراء کے مکانات ہیں۔ خود میرا مکان بھی دریائی جھونپڑا ہے۔ دریا کے کنارے یا اندر جھونپڑا بنانے پر کوئی پابندی نہیں ہے، اس لیے جو لوگ زمین کا ایک مرلہ بھی نہ خرید سکتے ہوں وہ یہاں جھونپڑا بنا لیتے ہیں۔ عبدالبیان یہ بات کرتے ہوئے ہنستا بھی جا رہا تھا جیسے وہ اپنی تقدیر پہ پھبتی کس رہا ہو۔ شمالی علاقہ کی خوشنما عمارتیں اور جنوبی علاقے کے قلبہ ہائے احزان، یہ عجب منظر ہے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

دریا کے پل پر کافی دیر تک ہم کھڑے رہے۔ برہنہ تن کشتی بان دریا کے اندر اپنی اپنی کشتیاں لیے پھرتے ہیں۔ چند موٹر بوٹیں بھی گزریں۔ سٹیمر بھی سیاحوں کو لیے لیے گھومتا پھر رہا ہے۔ جھونپڑوں سے نیچے اتر کر مرد اور عورتیں دریا میں غسل کر رہے ہیں۔ پانی ان کا اوڑھنا بھی ہے اور بچھونا بھی۔ اس دریا نے یہاں بڑے انقلابات دیکھے ہیں۔ مسلمانوں کی عظمت کے اس نے گیت گائے۔ اسپین کے تباہ کن حملوں اور اسپینی درندوں کے ظلم و ستم پر یہ زار زار رویا کیا۔ امریکی استعمار اور پھر جاپانی استبداد بھی اس کی چھاتی پہ مونگ دلتا رہا۔ اور اب صلیب پرست مارکوس کی خونخوار فوجیں رہ رہ کر اس کے پانی کو خون مورو سے رنگین

کر رہی ہیں۔ دریا نے یہ تمام انقلاباتِ زمانہ دیکھے، مگر موررو سے اُسے جو محبت ہے اُس میں بے وفائی نے راہ نہیں پائی۔ اگر موررو کو کہیں کھانے کو نہیں ملتا تو یہ انہیں اپنی نوع بنوع مچھلیاں پیش کر دیتا ہے اور اگر انہیں مینڈانا ؤ کی دھرتی جگہ نہیں دیتی تو یہ اپنا دامن اُن کے لیے وا کر دیتا ہے۔ اس کی موجیں اور موررو کے دلوں کی دھڑکنیں ایک ساتھ چلتی ہیں۔ بس شاد باش و شاد زی اے موررو کے ہمدم و ہمسفر۔ تو بہتا جا اور عراق دل نشین کے ساز کو چھیڑتا جا۔ وہ دن آنے والا ہے جب تیرے اندر صلیب عکس ریز ہونے کے بجائے توحید کے میناروں کا رُخِ تاباں جھلکے گا۔ ناقوسِ تثلیث کے بجائے اذانِ وحدانیت تیرے لغموں سے ہم آہنگ ہوگی ؎

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی بستیوں کو اُلٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

ماہی گیر مجاہد عبدالبیان نہایت سادہ اور درویش انسان ہے۔ اس کا لباس بھی نہایت معمولی ہے، مگر اس کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ بکھرتی رہتی ہے۔ عربی بولنے کا اُسے بہت شوق ہے۔ بول لیتا ہے، مگر تکلف کے ساتھ۔ اظہار ما فی الضمیر میں کامیاب ہوجاتا ہے باتیں تو اُس کی سادہ ہیں، مگر بڑی پُرسوز اور اثر انگیز۔ مجھے کہنے لگا: "هل تنشّرف غرفتی؟" ان الفاظ کا میرے دل پر جو اثر ہوا میں بیان نہیں کر سکتا۔ شاید اُس نے بڑی سوچ کے بعد یہ الفاظ زبان سے ادا کیے ہوں گے۔ ان الفاظ کے معنی یہ ہیں کہ: "کیا آپ میرے گھونسلے کو شرف بخشیں گے؟" اُس کے یہ الفاظ محبت اور ندامت دونوں کا عجب امتزاج ہیں۔ محبت اُسے مجبور کر رہی ہے کہ مجھے اپنے گھر بلائے اور ندامت اس بات پر ہو رہی ہے کہ مہمان کو کُٹیا دکھا کر کیا کروں گا۔ میں نے اُسے زیادہ تشویش میں نہیں ڈالا۔ فوراً عرض کیا: میں آپ کے گھر ضرور حاضری دوں گا، مگر مغرب کے بعد۔ میری اس تجویز کا مطلب یہ ہے کہ دن جن باتوں کو طشت از بام کر دیتا ہے رات کی تاریکی اُس پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ میری حاضری سے عبدالبیان کو خوشی ہو نہ کہ ندامت اور کہتری کا احساس ؎

تاریکی ہی غنیمت تھی فراز چاند نکلا تو دل ڈوب چلا

غیر مسلم آبادی کے رنگ و روپ

خاکسار، علی غنافی اور عبدالبیان واپس الکورازون آ رہے تھے۔ واپسی پر ہم ایک ایسے بازار سے گزرے جس کی دکانیں اور سٹور چکا چوند رکھتے تھے۔ سامان بھی خوب تھا۔ کپڑے کی دکانیں، جوتے اور کراکری کی دکانیں، زیورات اور سامانِ زیبائش کے شوکیس۔ علی غنافی میرا استفہامیہ چہرہ پڑھتے ہی بولا۔ یہ تمام عیسائیوں کی دکانیں ہیں۔ یہ بنک اور یہ کمپنیاں عام طور پر عیسائیوں کی ملکیت ہیں۔ ان میں مقامی عیسائی بہت کم ہیں۔ زیادہ تر لوزان اور بیسایا آئی لینڈ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان دکانوں میں ایک خاصا بڑا جنرل سٹور تھا۔ جس کا مالک ایک یہودی ہے۔ علی کہنے لگا، یہ معلوم نہیں کہ یہ یہودی کہاں سے آ گیا۔ فلپائن کے اصل باشندوں کے اندر تو کوئی یہودی خاندان نہیں ہے۔ ایک اور بڑی عمارت کی طرف انگلی اُٹھا کر علی نے بتایا کہ یہ ایک حضرمی عرب کی کمپنی ہے۔ اس کا نام عمر باجنید ہے۔ یہ کافی عرصہ سے یہاں کاروبار کر رہا ہے۔ اس ملک پر اس کا احسان یہ ہے کہ اس نے سب سے پہلے یہاں مسلمانوں کے لیے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ بہت سے علماء اس کے ادارے کے تعلیم یافتہ ہیں۔ اور وہ فخر سے کہتے ہیں کہ ہم "جنیدی" ہیں۔

چلتے چلتے جب شہر کے وسط میں اُسی پارک میں آ گئے جس کا پیچھے ذکر گزر چکا ہے تو علی پارک کی دیوار پر بیٹھے ہوئے ایک شخص کو لپک کر ملا۔ جس نے میلی کچیلی پتلون اور معمولی قیمت کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس دیوار پر خوانچے والے بیٹھتے ہیں یا بے روزگار لوگوں کے لیے یہ وقت گزارنے کی جگہ ہے۔ علی نے اپنے دوست کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ان کا نام بزشلونہ ہے (عجیب وغریب نام) اور یہ صاحب مینڈاناؤ کے ایک قدیم حکمران سلطان کُبنتُلان کے خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ یہ گردشِ زمانہ ہے، شہزادہ صاحب کے آباؤ اجداد حکمرانی کرتے رہے ہیں اور موصوف فٹ پاتھوں پر بیٹھے ہوئے غالب کے اس شعر کا مصداق بنے ہوئے ہیں ؎

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے